© rasailojaraid.com

اردو میں تاریخ نگاری

۱۹۴۷ء کے بعد کے تاریخی ادب میں نئے رجحانات کا تجزیہ

ڈاکٹر اقتدار حسین صدیقی

سیاسی آزادی کے بعد ہندوپاک میں اردو میں تاریخ پر اہم کام کا آغاز ہوا۔ پہلے یا تو تاریخ اسلام پر کتابیں لکھی گئیں یا پھر مشاہیر اسلام کی سوانح کا مطالعہ پیش کیا گیا۔ کچھ محققین نے قرونِ وسطیٰ کے ہندوستان کے سلاطین اور مغل شہنشاہوں کی تاریخ میں بھی خاصی دلچسپی لی۔ اس کی وجہ سے اردو میں تاریخ نگاری کا ارتقا ممکن ہوسکا۔ لیکن اس لٹریچر کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اردو میں مورخین کی دلچسپی حکمرانوں کے سیاسی کارناموں تک محدود تھی۔ آزادی کے بعد ہندوپاک کے دانشوروں نے قرونِ وسطیٰ کے ہندوستان کی تاریخ کے دوسرے اہم پہلوؤں کی طرف بھی توجہ مبذول کرائی۔ لہٰذا ہندوستان میں اسلامی فکر، مذہبی تحریکیں، علوم و ثقافت کی ترقی اور مختلف ادوار میں دانشورانہ رجحانات کا تحقیقی مطالعہ شروع ہوا۔ ذیل کی سطور میں ہندوپاک کے چند دانشوروں کی قرونِ وسطیٰ کے ہندوستان کی تاریخ پر تحقیق و تصنیف کا جائزہ پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

تاریخ کے موضوع پر ہندوستان میں اردو میں تحقیق و تصنیف کا کام زیادہ تر دار المصنفین، اعظم گڑھ اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ تاریخ کا رہین منت ہے۔ اعظم گڑھ میں صباح الدین عبدالرحمٰن کی تحقیق و کاوش کے نتیجہ میں متعدد کتابیں شائع ہوئی ہیں۔ تاریخی ادوار کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ہم اپنے مقالہ کا آغاز اُن کی کتاب بزم مملوکیہ سے شروع کر رہے ہیں[1]۔ بزم مملوکیہ میں ترک سلاطین

---

[1] قرونِ وسطیٰ کے ہندوستان کی علمی اور ادبی تاریخ پر صباح الدین عبدالرحمٰن کی تصنیف بزم تیموریہ ۱۹۴۸ء میں شائع ہوئی تھی۔ اس کے چھ سال بعد بزم مملوکیہ ۱۹۵۴ء میں شائع ہوئی۔ آسانی کے پیشِ نظر ہم نے بزم مملوکیہ پر پہلے تبصرہ کیا ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کے عہد (یعنی تیرہویں صدی عیسوی) میں علم و دانش کی ترقی کو پیش کیا ہے۔ سلطان قطب الدین ایبک (۱۲۰۶ء تا ۱۲۱۰ء) سے لے کر سلطان غیاث الدین بلبن (۱۲۶۶ء تا ۱۲۸۷ء) تک، سلاطین، شہزادوں اور امراء کی علم دوستی اور ادبی کارناموں کے متعلق بہت دلچسپ تفصیلات بہم پہنچائی ہیں۔ لیکن کہیں کہیں دورِ حاضر کے محققین کی رائے تاریخ کی اہم شخصیات کے متعلق من و عن تسلیم کر لی گئی ہے۔ اس کی وجہ سے کچھ تصحیح طلب غلطیاں جوں کی توں رہ گئیں ہیں۔ علاوہ ازیں تاریخی شخصیات کے متعلق عہد وسطیٰ کے ماخذوں میں موجود مواد کے غیر ناقدانہ طریقہ پر استعمال نے بھی کتاب کی اہمیت کو کم کر دیا ہے۔ ہم چند خامیوں کا اختصار کے ساتھ ذکر ضروری سمجھتے ہیں۔

سب سے پہلا اعتراض ترک سلاطین کے لیے مملوک کی اصطلاح کے استعمال پر کیا جا سکتا ہے۔ تیرہویں صدی میں تین سلاطین یعنی سلطان قطب الدین ایبک، سلطان التتمش اور سلطان غیاث الدین بلبن کے علاوہ دوسرے سب حکمراں جو کہ سلطنت دہلی کے تخت پر بیٹھے غلام کے بجائے شہزادے تھے۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ مذکورہ بالا تینوں غلام سلاطین تخت نشینی سے پہلے یا تخت نشینی کے وقت غلامی سے آزاد ہو چکے تھے[۵]۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فاضل محقق نے قرونِ وسطیٰ کے ہندوستان کی تاریخ پر مستشرقین کی چلائی ہوئی ایک اصطلاح کو بغیر تنقید کے قبول کر لیا ہے۔

ڈاکٹر نظام الدین نے سدید الدین محمد عوفی پر اپنے ایک تحقیقی مقالہ میں لکھا ہے کہ عوفی ۱۲۱۸ء میں وسط ایشیا پر چنگیز خاں کے حملہ کے وقت غزنی ہوتا ہوا لاہور پہنچا پھر جلد ہی ناصر الدین قباچہ، والئ پنجاب اور سندھ کا ملازم ہو گیا۔ تھوڑے ہی عرصہ کے بعد قباچہ نے گجرات کے اہم بندرگاہ، کھنبایت کو فتح کر لیا اور عوفی کو وہاں کے قاضی کے عہدے پر تعینات

---

[۵] سلطان قطب الدین ایبک نے اپنے آقا سلطان معز الدین کے قتل کے بعد اس کے جانشین اور بھتیجے سلطان محمود سے خطِ آزادی حاصل کیا تھا۔ جبکہ شمس الدین التتمش اور بلبن تخت نشینی سے بہت پہلے آزاد ہو چکے تھے۔

مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ کیجئے، خلیق احمد نظامی، سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات، دہلی ۱۹۵۸ء ص ص - ۸۸، ۱۰۵ - ۱۰۶، ۱۵۵ تا ۱۶۲

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کیا[۱] ۔ صباح الدین عبدالرحمٰن نے اس بیان کو صحیح تسلیم کرلیا ہے۔ حالانکہ واقعہ مختلف ہے۔ اگر جوامع الحکایات ولوامع الروایات موصوف کے پیش نظر ہوتی، جو کہ عوفی کا عظیم علمی شاہکار ہے، تو معلوم ہوتا کہ وہ چنگیز خاں کے وسط ایشیا پر حملے کے وقت مغربی ایشیا کے ملکوں کی سیر کر رہا تھا۔ اور وہاں سے کئی سال بعد بحری جہاز کے ذریعہ کھنبایت پہنچا تھا۔ جہاز میں اس نے قطب نما کو پہلی مرتبہ دیکھا اس کے ذریعہ سمت کا صحیح علم ہوا۔ وہ قطب نما کے عمل سے اس قدر متاثر ہوا کہ اس نے اس کی تشکل اور عمل کا تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ جوامع الحکایات میں قطب نما کا حوالہ پہلی مرتبہ ملتا ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مسلمان جہاز راں تقریباً ۱۲ ہویں صدی ہجری سے قطب نما کے استعمال سے واقف تھے[۲] ۔ کھنبایت پہونچ کر وہ وہاں کے حنفی مسلمان تجار کے ہاں ٹھہرا اور اُن کی مذہبی قیادت کے لیے قاضی کے فرائض انجام دینے لگا۔ کھنبایت میں مسلمان تجار کی علیحدہ آبادی تھی۔ ان کو ہندو راجہ کی طرف سے مکمل مذہبی آزادی ملی ہوئی تھی۔ کچھ عرصہ کے بعد کھنبایت ہی میں عوفی کی ملاقات اپنے ہم وطن مہاجر محمد سمرقندی سے ہوئی جو کہ ناصر الدین قباچہ کی ملازمت میں تھا اور سندھ سے کاروبار کے سلسلے میں کھنبایت آیا ہوا تھا۔ محمد سمرقندی عوفی کا مہمان ہوا اور زمانہ قیام میں عوفی کے مکمل کیے ہوئے قاضی التنوخی کی کتاب الفرج بعد الشدہ کے فارسی ترجمہ کا مطالعہ کیا۔ کچھ عرصہ کے بعد عوفی محمد سمرقندی کے ہمراہ اچہ چلا گیا اور وہاں ناصر الدین قباچہ کے دربار سے منسلک ہو گیا[۳] ۔

---

[۱] ملاحظہ ہو۔ M. NIZAMUDDIN, INTRODUCTION TO THE JAWA-MIUL-HIKAYAT-WA-LAWAMIUL-RIVAYAT, London. 1920 P.14

[۲] جوامع الحکایات ولوامع الروایات ۔ جلد سوم، مخطوطہ خدا بخش لائبریری، پٹنہ ورق ۔ ۵۲ ب

جوامع الحکایات چار جلدوں میں منقسم ہے۔ ہر جلد متعدد ابواب پر مشتمل ہے۔ اس کی ایک جلد دو حصوں میں حیدر آباد دکن سے بسعی محمد نظام الدین ۱۹۶۱ء اور ۱۹۶۵ء میں شائع ہوئی۔ پھر پہلی اور دوسری جلدیں ایران سے شائع ہوئیں۔ تیسری اور چوتھی جلدیں ابھی تک نہیں چھپی ہیں۔

[۳] جوامع الحکایات ۔ بخش دوم ۔ مولفہ ۔ نظام الدین، حیدر آباد دکن، ۱۹۶۵ء ص ص ۔ ۲۶۵ تا ۲۶۶ ۔ نیز محمد سمرقندی کا نوٹ جو کہ عوفی کے مکمل کیے ہوئے قاضی التنوخی کی تالیف کتاب الفرج بعد الشدۃ کے اخیر میں ملتا ہے۔ مخطوطہ فارسی ترجمہ، انڈیا آفس لائبریری لندن، ۱۲۲۲ء، اوراق ۵۶ ب تا ۵۹ ب۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سلطان التتمش کے مشائخ وقت سے روابط کے بارے میں مصنف کا بیان دورِ حاضر کے دوسرے تاریخ نگاروں کی طرح بزم مملوکیہ کے مصنف کا بیان تاریخی حقیقت کی بجائے افسانوی روایات پر مبنی ہے۔ بعد کی روایات کو بغیر کسی تحقیق کے تسلیم کرلیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر التتمش کے عہد کے سو سال سے بھی زیادہ عرصہ کے بعد عصامی نے اپنی کتاب فتوح السلاطین شائع کی۔ اس میں شاعر نے اُن مقبول عام روایات کو غیر ناقدانہ طور پر شامل کرلیا جو کہ لوگوں نے صوفیاء سے خواص و عوام کی عقیدت بڑھانے کے مقصد سے گھڑی تھیں۔ سلاطین دہلی کی منظوم تاریخ 'فتوح السلاطین میں ادارت نقل کی گئی ہے کہ التتمش ابتدائی زمانہ میں بغداد میں غلام کی حیثیت سے رہا۔ اس کا آقا صوفیاء کا معتقد تھا اور اکثر محفل سماع منعقد کراتا تھا۔ ایک شب محفل سماع میں صوفیاء کی خدمت میں رہا۔ مہمان صوفیا میں قاضی حمیدالدین ناگوری (سہروردی) بھی شامل تھے۔ جب وہ دہلی آئے اور سماع کو مقبول عام کرنے کے لیے کوشاں ہوئے تو علماء نے اعتراض کیا۔ اس پر سلطان التتمش نے بذریعہ محضر اس کو ممنوع قرار دینے کا فیصلہ کیا۔ جب سماع کے حامیوں کو طلب کیا گیا تو قاضی حمیدالدین ناگوری بھی حاضر ہوئے۔ دورانِ بحث سلطان کو مطمئن کرنے کے لیے انھوں نے اس کو یاد دلایا کہ وہ زمانۂ غلامی میں بغداد میں ایک شب اُن کے ساتھ محفل سماع میں شریک رہا تھا اور اس کی خدمت سے خوش ہوکر شیخ نے اس کے لیے دعا بھی کی تھی۔ اس کا سلطان پر خاطر خواہ اثر ہوا اور اس نے صوفیاء کو سماع کی اجازت دے دی۔[1] لیکن معتبر کتابوں سے اس روایت کی تصدیق نہیں ہوتی ہے طبقات ناصری کے معاصر مولف، منہاج سراج جوزجانی کے مطابق التتمش کا لڑکپن بخارا میں گزرا۔ بعد میں وہ غزنی لایا گیا اور غزنی کے پاس اس کو دہلی میں قطب الدین ایبک کے ہاتھ فروخت کردیا گیا تھا۔[2] شیخ نظام الدین اولیاء کی ملفوظات، فوائدالفواد کی بنا پر ہم بعد میں ثابت کریں گے کہ التتمش کے عہد میں علماء کا زبردست اثر تھا اور صوفیاء کرام چھپ کر بند گھروں میں سماع فرماتے تھے۔

شعراء کے احوال میں بھی کہیں کہیں واقعات کو صحیح طور پر پیش کرنے میں ناکامی ہوئی ہے۔

---

[1] عصامی، فتوح السلاطین مولفہ یوشع، مدراس، ۱۹۴۸ء ص ص ۱۱۸ - ۱۲۰

[2] طبقات ناصری، بتصحیح عبدالحئی حبیبی، کابل، ۱۳۴۲ء شمسی، جلد اول، ص ۴۴۱

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اکثر شعراء کے قصائد میں ممدوحین کی شناخت غلط ہے۔ اس کی وجہ بھی دورِ حاضر کے محققین کی رائے کو من وعن مان لینا ہے۔ مثال کے طور پر تیرہویں صدی عیسوی کے نصف آخر کے نامور شاعر عمید لونیکی سنامی کے ممدوحین کی شناخت مشکل ہے۔ کیونکہ معاصر تاریخوں میں اُن کا ذکر نہیں ہے اور اگر ہے تو اُن ناموں کے ایک سے زائد اشخاص ہیں لیکن یہ مشکل سب ممدوحین کی شناخت میں حائل نہیں ہوتی۔ ان میں سے ایک ممدوح کا نام قصائد میں سلطان نصیر الحق محمد بلبن بتایا ہے۔ ڈاکٹر اقبال حسین اپنی انگریزی کتاب THE EARLY PERSIAN POETS OF INDIA میں سلطان نصیر الحق محمد بلبن کی صحیح شناخت سے قاصر رہے ہیں[1] صباح الدین عبدالرحمٰن نے اس ممدوح کو سلطان غیاث الدین بلبن بتایا ہے[2] اس سلسلے میں معاصر تاریخ، طبقات ناصری اور اس کے بعد برنی کی تاریخ فیروز شاہی اور عصامی کی فتوح السلاطین مددگار ہوسکتی تھیں۔ منہاج سراج جوزجانی کے مطابق سلطان ناصر الدین محمود کے عہد حکومت میں ولایت ملتان اور سندھ عزالدین بلبن کشلو خاں کی ریاست میں تھی یہ عزالدین بلبن کشلو خاں سلطان ناصر الدین محمود اور اس کے نائب الغ خاں اعظم یعنی بعد کے سلطان غیاث الدین بلبن سے خفا ہو کر ۱۲۵۵ء میں باغی ہوا اور اپنے تحفظ کے لیے ایران کے زیلخاں، ہلاکو کا مطیع ہوگیا[3] برنی نے اسی محمد بن بلبن کی بہادری اور تیر اندازی کی تعریف کی ہے۔ لکھا ہے "محمد کشلو خاں در قسم فضیلت تیر اندازی در خراسان ہندوستان نظیر خود نداشت"[4] عصامی نے مزید اطلاع بہم پہنچائی ہے کہ سلطان ناصر الدین محمود کے عہد کے آخر میں بلبن نے ملتان پر دہلی سے فوج کشی کی۔ اس وقت ملتان میں

---

1. IQBAL HUSAIN, THE EARLY PERSIAN POETS OF INDIA PATNA 193 F, P. 201

2. بزم مملوکیہ۔ ص ص ۲۰۲-۲۰۵ - جنوری ۱۹۵۸ء میں ڈاکٹر نذیر احمد، سابق صدر شعبۂ فارسی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے عمید کے خلاصہ کو مختلف تذکروں اور بیاضوں اور نامکمل دیوان کی مدد سے یکجا کرکے دیوان کی شکل میں لاہور (پاکستان) سے شائع کیا ہے۔ انھوں نے محمد بلبن کو سلطان بلبن کے بڑے بیٹے شہزادہ محمد معروف بہ خان شہید سے تعبیر کیا ہے

3. طبقات ناصری، جلد دوم، کابل۔ دیکھیے دیوان عمید۔ مجلس ترقی ادب، لاہور۔ ص ۴۰

4. تاریخ فیروز شاہی، کلکتہ ۱۸۶۲ء ص ۶۶

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

محمد بن بلبن کشلو خاں حکمرانی کر رہا تھا۔ بلبن نے محمد کے ساتھیوں کو لالچ دے کر اپنی طرف کر لیا اور پھر ملتان کے قلعہ پر آسانی قابض ہوگیا۔ محمد بن بلبن کشلو خاں ملتان سے بھاگ کر منگولوں کی پناہ میں چلا گیا[1]۔ دراصل فاضل مصنف نے محمد بلبن میں اضافت البنی کو نظر انداز ہی نہیں کیا بلکہ تیرہویں اور چودھویں صدی کی تاریخوں کا بھی بغور مطالعہ نہیں کیا۔

سلطنت کے ابتدائی دور کی نثری کتابوں کی تاریخی اہمیت کا تعین کرنے میں بھی احتیاط سے کام نہیں لیا گیا ہے۔ حسن نظامی کے طرز انشاء کے متعلق لکھا ہے کہ تاج المآثر کا طرز مقبول نہیں اور دلیل یہ ہے کہ حسن نظامی کے معاصر منہاج سراج (جوزجانی) نے طبقات ناصری میں اُس کا تتبع نہیں کیا۔ غالباً فاضل تاریخ نگار یہ بھول گئے کہ طبقات کی شکل میں تاریخ لکھنے کے لیے قرون وسطیٰ کے مورخین آسان طرزِ انشاء اختیار کرتے تھے۔ دوسرے فارسی میں معرب اور مسجع نثر لکھنا ہر عالم کے لیے آسان بھی نہیں تھا۔ اس کے لیے ایک خاص مزاج، محنت اور کاوش کی ضرورت تھی۔ اگر بزم مملوکیہ کے مصنف تاج المآثر کے بعد ہندوستان اور ایران میں لکھی گئی تاریخ کی کتابوں کا موازنہ کرتے تو معلوم ہوتا کہ تاج المآثر کے طرز انشاء کا اثر ہر اُس تاریخ نگار پر ہوا جو فارسی میں معرب نثر لکھ سکتا تھا۔ اور جبکہ اس کو کسی عظیم فاتح کے کارناموں کی تاریخ لکھنی پڑتی تھی۔ جب عطا ملک جوینی نے چنگیز خاں کی تاریخ لکھی تو اُس نے جہاں کُشا میں مشکل طرزِ انشاء ہی استعمال کیا۔ اسی طرح چودھویں صدی کے آغاز میں دہلی سلطنت کے سب سے عظیم سلطان علاء الدین خلجی کی فتوحات اور کارناموں کی تاریخ کے لیے مولانا کبیر الدین دہلوی اور امیر خسرو نے حسن نظامی ہی کے طرز کا اتباع کیا[2]۔ سولہویں صدی میں بھی ابوالفضل نے اکبر اعظم کے عہد کی تاریخ لکھنے میں حسن نظامی کی طرح مشکل اور معرب نثر کے طرز کو اپنایا۔ یہاں یہ بات قابل توجہ ہے کہ بہت سے مسلم مورخین علم تاریخ کے متعلق ایک خاص تصور رکھتے تھے۔ اُن کے مطابق علم تاریخ کا مطالعہ کا حق خواص (ELITE) کو تھا۔ علم تاریخ کا تعلق عوام

---

[1] فتوح السلاطین، ص۔ ۱۵۴-۱۵۵، نیز راقم کا مقالہ THE QARLUGH KINGDOM IN THE NORTH-WESTERN INDIA, ISLAMIC CULTURE, HYDERABAD APRIL, 1980 PP 85-86

[2] برنی کے مطابق مولانا کبیر الدین پسر تاج الدین عراقی، علاء الدین خلجی کے عہد کی تاریخ کئی جلدوں میں لکھی تھی ان کے انشاء پردازی کے بارے میں برنی "ساحری کردہ" کے الفاظ استعمال کرتا ہے۔ تاریخ فیروز شاہی، ص۔ ۱۲

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

یا کم پڑھے لکھے لوگوں سے نہ تھا[1] اکثر مورخین عظیم فاتح اور فرماں روا کی تاریخ لکھنے کے لیے ایسا طرز اختیار کرنا ضروری سمجھتے تھے جو عام فہم نہ ہو اور ہیرو کی عظمت سے مطابقت رکھتا ہو۔

تیرہویں صدی میں ترک سلاطین اور امرا کی سرپرستی میں جو قدیم اور اہم عربی کتابوں (CLASSICS) کا فارسی میں ترجمہ ہوا اس کی اہمیت پر خاطر خواہ روشنی نہیں ڈالی گئی ہے۔ ان ترجموں میں سے صرف امام غزالی کی معرکۃ الآرا تصنیف "احیاء علوم الدین" کے فارسی ترجمہ (مترجم مجدالدین موید محمد الجاجرمی) کا تذکرہ محمد شفیع کے مقالے کے حوالہ سے کیا گیا ہے[2] دوسری کتابوں کے ترجموں کا ذکر بھی نہایت ضروری ہے کیونکہ یہ سب ترجمے کئی اعتبار سے تاریخی اہمیت کے حامل ہیں۔ وسط ایشیا اور افغانستان سے آئے ہوئے مہاجرین کی اکثریت عربی سے نابلد تھی۔ ابتداء میں مدرسوں اور علماء کی بھی کمی تھی۔ لہٰذا سلاطین اور اُن کے علم دوست امراء نے حتی الوسع کوشش کی کہ تمام اہم عربی کتابوں کا فارسی میں ترجمہ کرایا جائے تاکہ علم کا فروغ ہو سکے۔ بہت سے نووارد علماء اور فضلا اس کام میں لگائے گئے۔ نتیجۃً بہت سی عربی نوادر (CLASSICS) کا فارسی میں ترجمہ ہندوستان ہی میں ہوا۔ بعد میں یہ ترجمے مقبول ہوئے اور آج یہ قدیم فارسی ادب (CLASSICS) کا گراں قدر حصہ تصور کئے جاتے ہیں۔ امیر خسرو اور برنی نے احیاء العلوم کے فارسی ترجمے کی علمی اور ادبی اہمیت کا اپنی کتابوں میں ذکر کیا ہے[3] امیر خسرو نے احیاء العلوم کے مترجم مجدالدین موید محمد الجاجرمی کے طرز انشاء کو عہد آفریں بتایا ہے۔ اس کے ذریعہ فارسی نثر دینی علوم اور فلسفیانہ موضوعات کے لیے موزوں سمجھی جانے لگی[4] اسی طرح البیرونی کی طب پر کتاب الصیدلہ کا ترجمہ تھا جس کو الکاسانی نے التتمش کے وزیر نظام الملک جنیدی کی سرپرستی میں کیا تھا[5] ان ترجموں سے پہلے سدیدالدین محمد عوفی

۱؎ ایضاً ص ۱۵-۱۶

۲؎ یہ مقالہ اورینٹل کالج میگزین، لاہور میں نومبر ۱۹۳۷ء اور مئی ۱۹۳۸ء کے نمبر میں شائع ہوا تھا۔ صباح الدین عبدالرحمٰن نے اس کا حوالہ دیا ہے۔

۳؎ تاریخ فیروز شاہی ص ۳۴۶

۴؎ خسرو، رسالہ اعجاز خسروی، نول کشور، جلد اول، ص ص ۵۵-۵۶

۵؎ فارسی ترجمہ کتاب الصیدلہ، از ابوبکر علی بن علی بن عثمان کاسانی، مرتبہ منوچہر ستودہ و ایرج افشار، ایران، ۱۳۵۲ھ شمسی، ص ۶-۸

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ناصر الدین قباچہ کی سرپرستی میں قاضی التنوخی کی کتاب الفرج بعد الشدۃ کا ترجمہ اچھے میں کر چکے تھے۔ التتمش کے بعد میں ملتان میں شیخ بہاء الدین زکریا کے ایک مرید نے شیخ شہاب الدین سہروردی (المتوفی ۶۳۲ھ) کی شہرہ آفاق کتاب عوارف المعارف کا فارسی میں ترجمہ کیا[1]۔ ان مختلف النوع ترجموں کے ذریعہ دینی اور سائنسی علوم کا فروغ ہی ممکن نہیں ہوا بلکہ فارسی نثر کی بھی ترقی ہوئی۔ یہ بات بڑی اہم ہے کہ فارسی نثر کی ابتدائی تاریخ میں سلطنت دہلی کے ابتدائی لٹریچر کو اوّلین مقام حاصل ہے۔

غالبًا کتاب کی ضخامت بڑھانے کے لیے بزم مملوکیہ میں ضیاء بخشی کا ذکر کیا گیا ہے۔ ان کی تصانیف سے صاف طور پر ظاہر ہوتا ہے کہ وہ تیرہویں صدی کے بجائے چودھویں صدی کے عالم اور دانشور تھے۔ لیکن نزہتہ الخواطر کے حوالہ سے اُن کو سلطان التتمش کے ہمعصر، نامور شاعر مہرہ کا شاگرد بتایا گیا ہے۔ حالانکہ ضیاء بخشی اور شہاب مہرہ کے زمانہ میں تقریبًا سو سال کا بعد ہے۔ ضیاء بخشی سلطان علاء الدین خلجی کے عہد سے محمد بن تغلق کے عہد تک رہے۔ وہ چودھویں صدی کے صوفی بزرگ شیخ فرید الدین ناگوری کے مرید بھی تھے۔ کوئی معتبر شہادت ایسی نہیں ہے جس سے اُن کا کوئی تعلق شہاب مہرہ یا اُن کے عہد سے ثابت ہو سکے۔

بزم مملوکیہ کے برعکس بزم تیموریہ زیادہ معیاری تصنیف ہے۔ اس میں بابر بادشاہ سے لے کر اکبر کے عہد تک علم و دانش اور ادب کی تاریخ دلچسپ پیرایہ میں لکھی گئی ہے۔ کہیں کہیں جنگوں کی تفاصیل کا شمول غیر ضروری معلوم ہوتا ہے۔ بہتر ہوتا اگر اکبر کے زمانہ کے نئے مذہبی رجحانات اور اکبر پر ان کے اثرات کا ذکر کیا جاتا۔ اس سلسلے میں اکبر کے عہد کے لٹریچر میں جو مواد ملتا ہے اس کی ناقدانہ طریقہ پر توجیہہ ضروری ہے۔ شیخ عبد الحق محدث دہلوی کی تالیف مدارج النبوۃ، شیخ احمد سرہندی کی اثبات النبوت اور عبد القادر بدایونی کی تالیف

---

[1] عوارف المعارف کا سب سے پہلا ترجمہ شیخ بہاء الدین زکریا کے مرید قاسم داؤد خطیب نے ۱۲۴۰ء کے لگ بھگ کیا تھا۔ قاسم داؤد خطیب ملتان کے رہنے والے تھے اور تبحر علمی کے لیے مشہور تھے۔ ان کے ترجمہ کا نادر مخطوطہ مولانا آزاد لائبریری مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں موجود ہے۔ دیکھئے نذیر احمد

THE OLDEST PERSIAN TRANSLATION OF THE AWARIFUL-MAARIF, INDO-IRANICA, CALCUTTA DEC. 1972 PP. 20-50

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

نجات الرشید کا مطالعہ مفید ہو سکتا تھا کیونکہ ان کتابوں سے اکبر کے نظریات سے اس وقت کے علماء میں جو بے چینی پیدا ہو گئی تھی اس پر اچھی روشنی پڑتی ہے۔ تینوں کتابوں میں سے اکبر کے عقائد اور دعووں کی تردید ملتی ہے۔ ان کتابوں کے شائع کرنے سے مولفین کا مقصد اسلامی عقائد اور شعائر کی حمایت کرنا تھا۔ بزم تیموریہ میں بدایونی کی نجات الرشید پر صرف ایک جملہ ہے کہ "اس میں گناہِ کبیرہ اور گناہِ صغیرہ پر بحث کی ہے"۔[51] حالانکہ اس میں قرآن، حدیث اور فقہ پر بحث کے علاوہ اکبر کے عہد کی ثقافت، درپیش مذہبی مسائل اور سماج کے آداب کا بھی ذکر ملتا ہے[52] جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے نجات الرشید پہلی کتاب ہے جو اس واقعہ کی نشاندہی کرتی ہے کہ شیخ احمد سرہندی سے کافی پہلے ہندوستانی علماء شیخ علاء الدین سمنانی کے تصور وحدت الشہود کو ابن عربی کے فلسفہ وحدت الوجود کے مقابلہ میں کتاب و سنت کے مطابق سمجھتے تھے۔[53]

مذکورہ بالا تصانیف کے علاوہ صباح الدین عبدالرحمٰن کی "بزم صوفیہ" بھی ایک اہم موضوع سے متعلق ہے۔ اس کا پہلا ایڈیشن ۱۹۴۹ء میں شائع ہوا تھا۔ دوسرا ایڈیشن نظرثانی اور مزید اضافہ کے ساتھ ۱۹۷۱ء میں چھپا۔[54] اس میں پندرھویں صدی کے نصف اول تک کے صوفیاء کے حالات بیان کیے گئے ہیں۔ بے شک قرونِ وسطیٰ کے ہندوستان میں صوفیاء کرام کا تاریخی رول بہت اہم ہے۔ مصنف ان لوگوں میں سے ہیں جنھوں نے صوفیاء کے تاریخی رول کی اہمیت کو محسوس کر کے تصوف اور صوفیاء پر تحقیق و تصنیف کا آغاز کیا۔ ان کو اپنے اس موضوع سے متعلق ماخذوں کے نقص کا بھی پورا احساس تھا۔ لہٰذا ابتداء ہی میں فرماتے ہیں "اب تک صوفیاء کرام کے جتنے تذکرے لکھے گئے ہیں اُن میں زیادہ تر اُن کی کرامت و خوارق عادات کی تفصیل بیان کی گئی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اُن بزرگانِ دین

---

[51] بزم تیموریہ، اعظم گڑھ ۱۹۴۸ء، ص ۔ ۲۶۱

[52] ملا عبدالقادر بدایونی نے نجات الرشید کو ۱۵۹۲ء میں شائع کیا تھا۔ یہ تعلیم یافتہ مسلمانوں کے مطالعہ کے لیے لکھی گئی تھی تاکہ وہ شرعی احکامات کا اتباع کر کے انسان اعلیٰ معیار کی زندگی بسر کر سکے۔

[53] نجات الرشید، مرتبہ سید معین الحق، لاہور ۱۹۷۲ء، ص ص ۔ ۴۵ ۔ ۵۰، ۵۷ ۔ ۵۸، ۵۹ وغیرہ

[54] ہم نے دوسرا ایڈیشن استعمال کیا ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کی اصلی تصویر نظروں سے بالکل اوجھل رہی۔ ممکن ہے اس حقیر تالیف میں ناظرین کو ہندوستان کے مشائخ کی کچھ ایسی تصویریں ملیں جو اور تذکروں میں شاید نہ مل سکیں۔"[1]

چونکہ پہلے ایڈیشن پر تبصرے سخت ہوئے تھے۔ خاص طور پر یہ اعتراض کیا گیا تھا کہ کتاب کی تکمیل میں مشائخ کے وضعی اور ناقابل اعتماد ملفوظات اور بعد میں لکھے گئے اُن فارسی تذکروں کو استعمال کیا گیا ہے جو کہ واقعات کی بجائے افسانوی حکایات سے بھرپور ہیں اس لیے دوسرے ایڈیشن میں مصنف نے ایک طویل ضمیمہ شامل کیا ہے اور اس میں اُن ماخذوں کے استعمال کا جواز پیش کیا ہے۔ دلیل یہ ہے کہ دہلی سلطنت کے ابتدائی دور کے عظیم صوفیاء کے حالات صرف اُن ہی ماخذوں میں تفصیل کے ساتھ ملتے ہیں۔ اس دلیل سے تاریخ کا طالب علم مطمئن نہیں ہو سکتا۔ تاریخ کے محقق کے اہم فرائض میں تاریخی شہادت کو پرکھنا بھی ہے اسے ناقدانہ طور پر یہ ثابت کرنا ہوتا ہے کہ اس کے ماخذ یا مقبول عام روایتوں میں حقیقت کا کتنا شائبہ ہے۔ شیخ معین الدین چشتی اجمیری اور شیخ قطب الدین بختیار کاکی کی ملفوظات کو ہر دور میں سنجیدہ لوگوں نے وضعی اور ناقابل اعتماد سمجھا ہے۔ اُن کے بارے میں شیخ نظام الدین اولیا اور ان کے خلیفہ شیخ نصیر الدین چراغ دہلی کے بیانات بہت اہم ہیں۔ جب شیخ نظام الدین اولیاء سے ایک عقیدت مند نے کہا کہ اودھ میں ایک ایک شخص نے اس کو ایک کتاب دکھائی اور اُس کو آپ کی تصنیف بتایا۔ شیخ نے جواب میں فرمایا کہ "اُس نے غلط بتایا۔ میں نے کوئی کتاب نہیں لکھی ہے۔"[2] ایسے ہی ایک موقع پر شیخ نصیر الدین چراغ دہلی کا ردعمل تھا اپنے زمانہ کی وضعی ملفوظات پر جو کہ ابتدائی دور کے چشتی بزرگوں سے منسوب کی جاتی تھیں تنقید کرتے ہوئے انھوں نے کہا: "این نسخہا بر من ہم رسیدہ است، مردان بسیار الفاظ است کہ مناسب اقوال ایشان نیست، بعد ازاں فرمودند کہ خدمت شیخ نظام الدین می فرمود کہ من ہیچ کتابی نہ نوشتہ ام زیرا کہ خدمت شیخ الاسلام فرید الدین و شیخ الاسلام قطب الدین و خواجگان چشت قدس اللہ ارواحہم و از مشائخ شجرہ ما ہیچ شخصی تصنیف نہ کردہ است۔"[3]

---

[1] بزم صوفیاء، اعظم گڑھ ۱۹۷۱ء ص ۴

[2] فوائد الفواد، نول کشور پریس، ص۔ ۵۴

[3] حمید قلندر، خیر المجالس، بالتصحیح خلیق احمد نظامی، بمبئی ۱۹۵۹ء ص ۵۲۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

دونوں بزرگوں کے مذکورہ بالا بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ وضعی ملفوظات چودھویں صدی میں دستیاب تھے اور عظیم چشتی صوفیاء کی نگاہ میں یہ افسانوں سے زیادہ اہمیت نہ رکھتے تھے۔ مجاوروں اور سجادہ نشینوں نے مزاروں کو پُرکشش بنانے کے لیے ان کتابوں میں وہ قصے شامل کیے تھے جن کا حقیقت سے کوئی تعلق نہ تھا۔ اسی طرح سولھویں صدی میں اخبار الاخیار[1] اور زاد المتقین وسلوک طریق الیقین[2] کے علاوہ صوفیاء کے جو تذکرے مرتب کیے گئے ان میں زیادہ تر روایتیں افسانوی ہیں۔ یہاں ہم مثال کے طور پر اختصار کے ساتھ شیخ جلال الدین تبریزی (سہروردی) اور سلطان شمس الدین التتمش کے عہد کے شیخ الاسلام کے مابین جھگڑے کا ذکر کریں گے۔

صباح الدین عبدالرحمٰن اور اردو میں دوسرے لکھنے والے محققین نے شیخ جلال الدین تبریزی کے حالات شیخ جمال کنبو کی تالیف "سیر العارفین" کے حوالہ سے لکھتے ہیں کہ شیخ جلال الدین تبریزی مختلف اسلامی ممالک کی سیر کے بعد دہلی میں آکر سکونت پذیر ہو گئے۔ یہ سلطان التتمش کا زمانہ تھا۔ اپنی روحانی صلاحیتوں اور پرکشش شخصیت کی وجہ سے تھوڑے ہی عرصہ میں ہر دل عزیز بزرگ ہو گئے۔ اُن کی شہرت اور مقبولیت دیکھ کر دہلی سلطنت کے شیخ الاسلام نجم الدین صغریٰ کو اس قدر حسد ہوا کہ انھوں نے اُن کے خلاف دہلی کی ایک رقاصہ سے سازش کی۔ رقاصہ کا نام گوہر تھا۔ نجم الدین صغریٰ نے اس کو کثیر رقم کے عوض آمادہ کیا تھا کہ وہ سلطان کے سامنے شیخ پر الزام لگائے گی کہ شیخ کے اُس سے

---

[1] اخبار الاخیار شیخ عبدالحق محدث دہلوی کی تالیف ہے۔ اس میں دہلی سلطنت سے لے کر اکبر کے عہد تک کے علماء اور صوفیاء کے حالات ہیں۔ اُن کی تصنیفات اور تعلیمات پر یہ معیاری کتاب ہے۔ مولف نے ہزاروں کتابوں کا مطالعہ کیا تھا اور بہت اہم کتابوں سے نمونہ کے طور پر اقتباسات بھی دئے ہیں۔ ملاحظہ کیجئے اخبار الاخیار۔ مطبع مجتبائی دہلی، ۱۳۰۹ھ

[2] زاد المتقین وسلوک طریق الیقین بھی شیخ عبدالحق محدث دہلی کی تالیف ہے۔ اس میں شیخ علی متقی اور شیخ عبدالوہاب متقی کے حالات کے علاوہ مکہ اور مدینہ میں بسنے والے ہندوستانی شیوخ اور علماء کے حالات بھی ملتے ہیں۔ اس کے دو مخطوطہ معلوم ہوئے ہیں ایک رضا لائبریری رامپور میں ہے اور دوسرا راقم الحروف کی ملکیت ہے۔

بعض لوگوں نے کم فہمی کی وجہ سے خدا کو

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ناجائز تعلقات تھے۔ معاہدہ کے مکمل ہونے پر سلطان التمش سے شکایت کی گئی اور شیخ کو سزا دلانے کے لیے محضر طلب کیا گیا[1]۔ اس محضر کے حکم کے شیخ بہاءالدین زکریا (سہروردی) بنائے گئے۔ آخرالذکر ملتان سے آئے تھے۔ محضر کی کاروائی سلطان کی موجودگی میں مسجد کے اندر شروع ہوئی۔ جب گوہر بیان دینے کے لیے عدالت میں حاضر ہوئی تو وہ شیخ جلال الدین تبریزی کی عظمت سے اس قدر متاثر ہوئی کہ جھوٹ نہ بول سکی۔ بلکہ اس نے سازش کو منکشف کردیا۔ اس سے سلطان کی نگاہ میں شیخ جلال الدین تبریزی کی عزت بڑھ گئی اور اُس نے نجم الدین صغریٰ کو شیخ الاسلام کے عہدے سے برطرف کردیا۔ لیکن شیخ جلال الدین تبریزی اس قدر کبیدہ خاطر ہوچکے تھے کہ وہ دہلی چھوڑ کر بنگال چلے گئے۔ اور وہاں اشاعتِ اسلام میں مشغول ہوگئے[2]۔

شہنشاہ اکبر کے عہد کے احمد خاں نبیرۂ شیخ سماءالدین کنبو نے بھی اپنی تالیف شجرۂ سہروردی میں اس روایت کو ذرا سے فرق کے ساتھ بیان کیا ہے۔ شجرۂ سہروردی کی داستان میں رقاصہ گوہر کی جگہ پر ایک خوبصورت غلام لڑکے کا ذکر ہے۔ بتایا گیا ہے کہ شیخ جلال الدین تبریزی نے ایک نوعمر، شکیل غلام لڑکے کو ڈیڑھ ہزار دینار (سکۂ زر) میں خریدا تھا۔ احمد خاں کے مطابق شیخ الاسلام نجم الدین صغریٰ نے شیخ جلال الدین تبریزی پر الزام لگایا تھا کہ غلام کے ساتھ اُن کا برتاؤ اور رویہ خلافِ اخلاق تھا۔ باقی تفاصیل سیرالعارفین کی طرح شیخ کے بے داغ کردار اور نجم الدین صغریٰ کی شیخ الاسلام کے عہدے سے برطرفی کے متعلق ہیں[3]۔

اس جھگڑے کے سلسلے میں مختصر لیکن صحیح شہادت شیخ نظام الدین اولیا کی ملفوظات 'فوائدالفواد' میں ملتی ہیں۔ شیخ نظام الدین کے مطابق شیخ الاسلام نجم الدین صغریٰ کے حکم سے شیخ جلال الدین تبریزی کی دہلی سے جلاوطنی واقع ہوئی تھی۔ آخرالذکر دہلی سے رخصت ہوکر بدایوں میں رہنے لگے تھے۔ بدایوں میں ایک دن اپنی خانقاہ کے دروازے پر کھڑے تھے کہ ایک ہندو رہزن دہی فروش کے بھیس میں آیا۔ جب شیخ کی پرتاثیر نظر اس پر پڑی تو رہزن

---

[1] محضر ایک خاص عدالت ہوتی تھی جو کسی دینی مسئلہ کو طے کرنے کے لیے طلب کی جاتی تھی۔

[2] شیخ جمالی کنبو، سیرالعارفین، مطبع رضوی، دہلی ۱۳۱۱ھ، ص ۱۶۹

[3] احمد خاں اکبرشاہی، شجرۂ سہروردی، مخطوطہ رضا لائبریری، رام پور، فارسی ۲۲۵۶ ورق ۴۶ الف تا ۴۸ الف۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اُن کے قدموں پر گر پڑا اور پھر مشرف بہ اسلام ہو کر اُن کی خانقاہ میں رہنے لگا۔ جلد ہی وہ ایک پرہیزگار درویش بن گیا۔ بعد میں اپنے شیخ کے جانشین کی حیثیت سے علی مولا کے نام سے مشہور ہوئے[۴۱] ایک دوسرے موقعہ پر شیخ نظام الدین اولیاء نے بتایا کہ ایک دن شیخ جلال الدین تبریزی بدایوں کے باہر اپنے مریدوں کے ساتھ دریا کے کنارے پر گھوم رہے تھے۔ اچانک مریدوں سے کہا کہ اُن سب کو نجم الدین صغریٰ کی نماز جنازہ ادا کرنی ہے۔ جب نماز جنازہ ادا ہو گئی تو شیخ نے فرمایا "نجم الدین صغریٰ نے مجھے دہلی سے نکالا تھا اللہ تعالیٰ نے اس کو دنیا ہی سے نکال دیا[۴۲] فوائد الفواد میں تیرہویں صدی کے صوفیاء کے سلسلے میں جو اطلاع ملتی ہے وہ صحیح اور غیر مخلوط ہے لیکن صباح الدین عبدالرحمٰن اور دوسرے اردو میں لکھنے والوں نے قصداً اسے نظرانداز کر دیا ہے[۴۳] سیر العارفین میں درج روایت دلچسپ مگر افسانہ ہے۔ اس کو شیخ نظام الدین اولیاء کے بیان پر فوقیت دینے کا کوئی جواز نہیں ہو سکتا۔

اسی طرح بزم صوفیا میں چشتی بزرگوں کے متعلق بھی غیر مصدقہ روایات کو استعمال کیا گیا ہے۔ اگلے صفحوں میں ہم اُن روایات کے ناقابلِ قبول ہونے پر بحث کریں گے۔ یہاں اتنا کہنا ضروری ہے کہ ابتدائی دور کے چشتی بزرگوں نے سلاطین سے کسی قسم کے روابط قائم نہیں کیے۔ وہ سلاطین وقت اور اُن کے دربار سے تعلق کو روحانی زندگی کے لیے مضر سمجھتے تھے۔ اردو میں تاریخ نگاروں نے نیم صحیح روایات کی بنا پر سلاطین کی صوفیاء کرام سے بے پناہ عقیدت دکھانے کی غرض سے عہدِ وسطیٰ کے لٹریچر میں موجود مواد کی صحت کے بارے میں وہ چھان بین نہیں کی، جس کی ایک تاریخ کے محقق سے امید کی جا سکتی ہے۔ غالباً مسلمانوں کے مذہبی معتقدات اور خوش عقیدگی کو مدنظر رکھتے ہوئے ہر اس روایت کو غیر ناقدانہ طور پر تسلیم کر لیا ہے جس سے صوفیا زیادہ پرکشش نظر آئیں۔ نتیجہ میں صوفیاء کے صحیح خدوخال سامنے نہیں آ سکے[۴۴]

---

[۴۱] فوائد الفواد، مولفہ میر حسن سنجری، نول کشور پریس، ص ۱۳۲ - ۱۳۳

[۴۲] فوائد الفواد، ص ۱۴۴

[۴۳] بزم صوفیہ، ص ۱۲۳ تا ۱۲۷

[۴۴] بزم صوفیا۔ ص ۱۲۳ - ۱۲۵ وغیرہ۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کتاب کا پہلا ایڈیشن شیخ محمد گیسو دراز پر ختم ہوگیا تھا۔ لیکن دوسرے ایڈیشن میں شیخ عبدالحق ردولوی پر ایک ضخیم باب کا اضافہ کردیا گیا ہے۔ اس باب کو مولانا شاہ معین الدین (مرحوم) نے لکھا ہے[1] اس باب میں مولانا شاہ معین الدین نے شیخ عبدالحق ردولوی صابری چشتی کے حفظ شریعت کی کوششوں اور اُن کے اتباع سنت کو بہت سراہا ہے۔ لیکن اُن کے اُن کارناموں کا بالکل ذکر نہیں کیا گیا ہے جو کہ صرف ہندوستانی ماحول ہی کی دین تھے۔ شیخ کے حالات کے سلسلے میں شیخ عبدالقدوس (متوفی ۱۵۳۷) کی تالیف انوار العیون پہلا اور بہت اہم ماخذ ہے۔ اس کتاب کے مطابق شیخ عبدالحق ردولوی ہندو یوگا فلسفہ سے بھی متاثر تھے۔ وہ یوگیوں کی طرح پاس انفاس یا حبس دم کے قائل تھے۔ وہ خود اور اُن کے مریدین مہینوں زمین میں دفن رہ سکتے تھے۔ اس کو قانونی جواز دینے کے لیے نماز معکوس کہتے تھے۔ شیخ کی تعلیمات اور شخصیت کی تصویر مکمل ہی نہیں ہوتی جب تک اُن کے اور یوگیوں کے مابین روابط اور یوگا کے اُن پر اثر کو پورے طور پر بیان نہ کیا جائے[2]

اب ہم صباح الدین عبدالرحمن کی تصنیف "ہندوستان کے عہد وسطیٰ کا فوجی نظام" پر بحث کریں گے۔ قرون وسطیٰ کے ہندوستان کے فوجی نظام، ہتھیاروں، آداب حرب اور جنگی جانوروں پر یہ اردو میں خصوصاً اور انگریزی میں بھی کسی حد تک پہلی تحقیق ہے۔ اس کی تکمیل میں معاصر اور بعد کے سب ماخذوں کو استعمال کیا گیا ہے جن میں سے بہت سے وہ ہیں جو چھپے نہیں ہیں اور صرف مخطوطوں کی شکل میں موجود ہیں۔ کتاب اپنے موضوع کی اہمیت اور نوعیت کی وجہ سے تاریخی لٹریچر میں ایک گراں قدر اضافہ ہے۔ لیکن اس تصنیف میں بھی معاصر مورخین کے بیانات کو بغیر کسی تنقید کے جوں کا توں تسلیم کرنے کی وجہ سے مصنف کے بیانات صحیح واقعات سے ہم آہنگ نہیں ہیں۔ بہتر ہوتا کہ تاریخی مواد کی توجیہہ کرتے وقت موقعہ یا محل سے

---

[1] ایضاً ص ۵۹۹ تا ۶۳۰

[2] ملاحظہ ہو تفصیل کے لیے SIMON DIGBY, ABDUL-QUDDUS GANGOHI (1456-1537 A.D): THE PERSONALITY AND ATHITUDES OF A MEDIEVAL INDIAN SUFI, MEDIEVAL INDIA: A MISCELLANY, ALIGARH 1975 VOL. 3, PP. 37-39.

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

متعلق شہادت (CIR CUMSTANTIAL EVIDENCE) سے موازنہ کرکے دیکھا جاتا کہ کوئی بات معاصر مورخ نے محض زورِ بیان کے لیے لکھ دی ہے یا حقیقت سے بھی کچھ مطابقت رکھتی ہے۔ مثال کے طور پر ضیاء الدین برنی سلطان غیاث الدین بلبن کے سلسلے میں کہتا ہے کہ ایک دن سلطان نے جنگ میں ہاتھی کی اہمیت بتاتے ہوئے کہا کہ ایک ہاتھی پانچ سو جنگی گھوڑوں کے برابر تھا[۱]۔ برنی نے اس بیان کو بغیر کسی تنقیدی جائزے کے تسلیم کرلیا ہے۔ اور یہی غلطی صباح الدین عبدالرحمٰن سے ہوئی ہے[۲]۔ میرے خیال میں اس کو زورِ بیان پر محمول کیا جاسکتا ہے۔ کیوں کہ قرونِ وسطیٰ میں جنگ صرف اچھے تربیت یافتہ گھوڑوں اور سواروں کی مدد سے جیتی جاتی تھی۔ سلطان معزالدین بن سام اور قطب الدین ایبک کی فتوحات میں گھوڑوں اور سواروں کا حصہ تھا۔ ہاتھی اُن کے مخالف ہندوؤں کے پاس تھے۔ لیکن ہندو حکمراں کہیں بھی مسلمانوں کا مقابلہ کامیابی سے نہ کرسکے تھے۔

علاوہ ازیں میدانِ جنگ میں ہاتھیوں کے استعمال اور ان کی کارکردگی پر بھی روشنی نہیں ڈالی گئی ہے۔ ماخذوں کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ جنگی ہاتھیوں کو دو صورتوں میں استعمال میں لایا جاتا تھا۔ اول یہ کہ جب میدانِ کارزار میں دشمن کا دباؤ بڑھتا تھا تو اس کو روکنے کے لیے ہاتھی آگے بڑھائے جاتے تھے۔ دوسرے جب بڑھتے ہوئے دشمن کی فوج میں ترتیب کو مزید درہم برہم کرنا ہوتا تھا۔ جنگ کی شروعات گھوڑ سواروں سے ہوتی تھی۔ تیز رفتاری کی وجہ سے جنگی گھوڑے کو عہدِ وسطیٰ سے جیٹ سے تعبیر کیا جاسکتا ہے اور ہاتھی کو ٹینک سے جس کو تیر کے ذریعہ بیکار کیا جاسکتا تھا۔ یا پھر اس کی زد سے بآسانی ہٹ کر بچا بھی جاسکتا تھا[۳]۔

کتاب میں جنگی گھوڑوں کی سپلائی اور ہندوستان میں اُن کی افزائشِ نسل کے مراکز کے بارے میں تفصیلات مختصر اور غلط ہیں۔ مصنف کا یہ بیان کہ "سلطان بلبن کی پائے گاہ

---

[۱] ہندوستان کے عہدِ وسطیٰ کا فوجی نظام ص ۱۳۷۰

[۲] مزید تفصیل کے لیے دیکھئے میری کتاب SOME ASPECTS OF AFGHAN DESPOTISM IN INDIA, ALIGARH. 1969. PP. 119-121

[۳] ہندوستان کے عہدِ وسطیٰ کا فوجی نظام — ص ۷۰

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

میں یعنی جہاں گھوڑوں کی نسلیں تیار ہوتی تھیں ہر قسم کے گھوڑے تھے۔ وہ سندھ سے بحری اور تاتاری گھوڑے منگایا کرتا تھا۔ پھر سامانہ، بھٹنڈہ اور بھٹنیر سے چیدہ چیدہ ہندی گھوڑے منگواتا تھا[1]۔ یہ یہاں نیم صحیح ہے۔ کسی معاصر مورخ نے یہ نہیں لکھا ہے کہ شاہی پائے گاہ میں گھوڑوں کی افزائش نسل کا بھی انتظام کیا گیا تھا۔ اور نہ ایسی کوئی شہادت ملتی ہے کہ جس کی بنا پر کہا جا سکے کہ دہلی یا اس کے قرب و جوار میں جنگی اہمیت کے گھوڑوں کی افزائش نسل کے مراکز قایم تھے۔ اس سلسلے میں علاقہ کی آب و ہوا کو بہت دخل تھا۔ "مسالک الابصار" اور "صبح الاعشیٰ" کے مؤلفین کے مطابق ہندوستان کی آب و ہوا اچھی نسل کے گھوڑوں کے لیے زیادہ سازگار نہ تھی۔ برنی کے مطابق پنجاب اور افغانوں کے علاقے یعنی پاکستان کے صوبہ سرحد میں اچھے گھوڑے پیدا ہوتے تھے جب وسط ایشیا سے منگولوں کے غلبے کی وجہ سے ہندوستان میں تاتاری گھوڑوں کی براہ راست درآمد کم یا ختم ہو گئی تو سلطان غیاث الدین بلبن کو اس سلسلے میں کسی بڑی پریشانی کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ ایک مرتبہ اُس نے امرا کو بتایا کہ اس کا بڑا بیٹا شہزادہ محمد جس کو اس نے ملتان اور سندھ کی ریاست سونپ دی تھی۔ ہر سال تاتاری اور بحری گھوڑے دہلی بھیجتا تھا۔ تاتاری گھوڑے افغان سوداگر خراسان سے لائے تھے یا پھر اپنے علاقے میں پالتے تھے۔ اسی طرح کھوکروں کے علاقہ میں جو کہ راولپنڈی اور جمو کے مابین واقع تھا جنگی گھوڑوں کی افزائش نسل کے مراکز تھے۔ یہ علاقہ بھی دہلی کے لیے گھوڑوں کی درآمد کا ذریعہ تھا۔ مشرقی پنجاب میں سامانہ، سنام اور بھٹنڈہ کے نام ملتے ہیں جہاں تجارت کے مقصد سے گھوڑوں کی پرورش ہوتی تھی[2]۔

---

[1] ہندوستان کے عہد وسطیٰ کا فوجی نظام۔ ص ۷۰

[2] تاریخ فیروز شاہی۔ ۵۳۔ نیز راقم کا مقالہ

THE AFGHANS AND THEIR EMERGENCE IN INDIA AS A RULING ELITE DURING THE DELHI SULTANAT PERIOD, CENTRAL ASIATIC JOURNAL (W. GERMANY) VOL. 26, No. 3-4 PP. 248-49

© rasailojaraid.com